R. No. 218057 Regd. No. 822

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Tele. No. 29
Telegrams "ANJUMAN"

۲۲ مئی ۱۹۶۳ء	ایڈیٹر: آل احمد سرور	جلد ۲۲۔ شمارہ ۲۰

ڈاکٹر قمر رئیس

مکتوب تاشقند

شاہ نیاز سرہندی کا اُردو دیوان تاشقند میں

'ہماری زبان' پابندی سے مل رہا ہے۔ اس سے اُردو دنیا اور اُردو دوستوں کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ اُردو نے جس تہذیب کے گہوارے میں رنگ روپ اور زندگی و توانائی حاصل کی ہے اس کے روایات اور آثار آج بھی تاشقند میں خصوصاً پرانے تاشقند میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اُردو اور ازبکی زبان میں چالیس فی صد سے زائد الفاظ مشترک ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ الفاظ جس سماجی معاشرت، تہذیبی فضا اور ذہنی کیفیت کی علامت ہیں وہ بھی مشترک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ازبک لوگوں کی زبان، زندگی اور قومی ذہنیت سے مانوس ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

یوں تو سوویت یونین میں دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کو ایک خاص مقام اور احترام حاصل ہے۔ ہر اسکول میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، لاطینی، عربی اور چینی وغیرہ لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہیں لیکن کم از کم ازبکستان میں اُردو کو ان تمام غیر ملکی زبانوں میں نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ اکثر لوگ اُردو کو ازبکی زبان کی بہن یا سوتیلی بہن سمجھتے ہیں۔ شاید آپ کے علم میں ہو گا کہ تاشقند، سمرقند، بخارا اور اندیجان کے متعدد اسکولوں میں دوسری جماعت سے لے کر گیارہویں جماعت تک اُردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

ازبکستان میں تاشقند اور تاشقند یونی ورسٹی اُردو زبان و ادب کی تعلیم کا مرکز ہے۔ ہندوستانی لسانیات کے شعبے میں اس وقت لگ بھگ سو طلبہ اُردو اور ہندی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ازبکی زبان میں اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف کے ترجمے خاص ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ادبی رسالوں اور اخباروں میں اکثر اقبال سے لے کر فیض تک کے کلام کے ترجمے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال فیض کے کلام کا ایک مجموعہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ حال ہی میں ازبکی زبان میں پریم چند کے گئودان کا مکمل ترجمہ شائع ہوا ہے اور بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اور عنقریب اُردو کے جدید شعرا کے کلام کا ایک انتخاب شائع ہونے والا ہے۔ اب کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ ازبک شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف بھی اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ اس سلسلے میں مجھے بھی کچھ خدمات سونپی گئی ہیں۔

یہاں کے بعض ممتاز ادیبوں سے ملا مثلاً زلفیہ خانم اور ازبکستان کی ادیبوں کی انجمن کے صدر حمید غلام دونوں ہندوستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان سے بات چیت کر کے معلوم ہوا کہ ان حضرات کو ہندوستان میں تاج محل کے بعد اگر کسی شے نے متاثر کیا ہے تو وہ اُردو مشاعرے ہیں۔ یہاں تک کہ زلفیہ خانم نے اُردو مشاعرے کے عنوان سے ایک طویل اور بامزہ نظم بھی کہہ ڈالی۔ ہاں یہ عرض کر دوں کہ پہلے یہاں مشاعرے جیسی کوئی چیز ہوا کرتی تھی اب نہیں ہوتی۔

اُردو زبان و ادب کے بعض سنجیدہ طالب علم تحقیقی کام بھی کر رہے ہیں۔ بنی جان صاحب سردار جعفری کی شاعری پر، زینت اللہ صاحب منٹو کے فن پر اور جناب عارف و ادبی گلشن خواجہ احمد عباس کی حقیقت نگاری پر کنڈیڈیٹ یعنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے مقالے لکھ رہے ہیں۔ ان حضرات سے اکثر ملاقات اور بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ بنی جان صاحب کا کام تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ زینت اللہ صاحب بھی بڑی محنت اور بصیرت سے کام کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ منٹو کی تمام تصانیف انھیں ابھی تک دستیاب نہیں

ہو سکیں۔ کاش کوئی اردو دوست یا منٹو پرست انھیں منٹو کی نمایندہ تصانیف اور نقوش کا منٹو نمبر تحفۃً بھیج دے۔ ان کے علاوہ محترمہ خواجا نوہ چمن عصمت چغتائی پر اور رعنا تیموروا کرشن چندر پر کام کر رہی ہیں۔ میرے ایک دوست اور رفیق محمد جانف حسن بیردی ازبکی زبان میں غالب کے کلام کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میں ذاتی دلچسپی لے رہا ہوں اور برابر انھیں ٹوکتا اور ترغیب دلاتا رہتا ہوں۔ مقامی سرکاری اشاعت گھر میں مشرقی ادبیات کے نگراں طاہر صاحب (جو اچھی اردو جانتے ہیں) اس سلسلے میں خاص دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن حسن بیردی صاحب اردو اور ازبکی زبان پر بھرپور قدرت رکھنے اور خود بھی نیم شاعر ہونے کی وجہ سے اس کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ ۱۹۶۳ء کے آخر تک یہ کام مکمل ہو جائے گا۔

تاشقند میں کئی شاندار کتب خانے ہیں جن میں فارسی، عربی اور ترکی وغیرہ کی قدیم اور نایاب کتابوں کے ذخیرے ہیں۔ ایک کتب خانے میں کچھ اردو کے قدیم اوراق بھی ہیں اور اس طرح میری دلچسپی کا کچھ سامان بھی ہاتھ لگا۔

ایک مشرقی کتب خانے میں شاہ نیاز احمد سرہندی بن شاہ رحمت اللہ سرہندی کے فارسی دیوان کا ایک مخطوطہ ہے اس کے آخر میں ان کا اردو دیوان بھی ضمیمہ کے طور پر منسلک ہے جس میں باقاعدہ ردیف وار غزلیں ہیں اور آخر میں کچھ ہندی بولیاں اور دوہے ہیں۔ نسخہ ۱۸۱۹ء میں کسی ازبک کاتب نے روسی کاغذ پر نقل کیا تھا۔ نیاز احمد سرہندی میر و سودا کے معاصر تھے۔ درویش اور صوفی آدمی تھے۔ سنہ ۱۲۵۰ھ غالباً مطابق ۱۸۳۴ء میں بریلی میں وفات ہوئی۔ اور دہلی بریلی اور آگرہ میں ہی زندگی کا بڑا حصہ گزرا۔ کلام زبان و بیان کے لحاظ سے صاف ستھرا شوخ اور شیریں ہے اور بیشتر کے صوفیانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ کاتب صاحب چونکہ غیر اردو داں تھے اس لئے جگہ جگہ خصوصاً افعال میں اصلاحیں فرما دی ہیں۔ جس کی وجہ سے بعض اشعار کا پڑھنا دشوار ہو گیا ہے۔ جہاں تک مجھے خیال ہے آب حیات سے لے کر اب تک اردو شاعری کی کسی مستند تاریخ میں نیاز سرہندی کا ذکر نہیں آیا۔ علی گڑھ تاریخ کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے کلام کے دوسرے نسخے ہندوستان میں کہیں ہیں یا نہیں؟ اس سلسلے میں بعض بزرگوں سے استفسار کیا ہے لیکن ابھی تک کسی کا جواب موصول نہیں ہوا۔ بہر حال میں نمونے کے طور پر ردیف الف کی ابتدائی چند غزلوں کے کچھ اشعار لکھ رہا ہوں:

گر کون و مکاں مظہر نیرنگ نہ ہوتا
ہر آن میں اپنا نیا ڈھنگ نہ ہوتا
ہوتا نہ اگر اس کے تماشے میں تحیر
حیرت سے میں آئینہ نمط دنگ نہ ہوتا

جادر سے موج کے نہ چھپے چہرہ آب کا
برقع حباب کا نہ ہو برقع حباب کا

آنکھیں جو مندی ہوئی ہوں تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں قصور کیا ہے بھلا آفتاب کا
اپنا حجاب آپ ہے تو اے میاں نیاز
اٹھنے میں تیرے ہوتا ہے اٹھنا حجاب کا

کیا جانے کس کی گھات میں نکلا کسا ہوا
وہ شوخ ہاتھ قتل جہاں پر رسا ہوا
اپنا تو ملک دل ہی کبھو سے اجڑ گیا
لیکن چراغ داغ سے گھر ہے بسا ہوا
دل خانۂ خدا ہے صنم اس کو مت گرا
ممکن نہیں جو پھر بنے یہ گھر گھسا ہوا
ہوتا ہے بوئے خندۂ گل سے شگفتہ دل
اس غنچہ لب کو دیکھا ہے جس نے ہنسا ہوا
اے مرغ دل اکھڑ گئے جب بال و پر مرے
اب کیا کرے گا دام سے چھٹ کر پھنسا ہوا
بیٹھا نہیں ہے ایسا مرے دل میں درد و غم
جن جی سے لئے جو نکلے یہ کانٹا دھنسا ہوا

عشق میں آ عجب مزا دیکھا
خویش و بیگانہ آشنا دیکھا
دیکھتا آپ ہے سنتے ہے آپ
نہ کوئی اس کے ماسوا دیکھا
دید اپنے کی تھی اسے منظور
آپ کو ہر طرح بنا دیکھا
تھا وہ برتر شماو ما سے نیاز
پھر وہی اب شما و ما دیکھا

تمہاری دوری میں ہم نے ساقی عجب ہی دور شراب دیکھا
ادھر تو واعظ گرا پڑا ہے ادھر کو زاہد خراب دیکھا
چمن میں نرگس کہیں ہے بیمار اس کی آنکھوں کو دیکھ کر کے
کہیں ہے زلفوں کے غم میں سنبل کہ ہائے کیا پیچ و تاب دیکھا
تمہارے عارض کے نیچے زلفوں کو دیکھ کر کیا مثال کہیے
برائے گفتن مگر یہ کہیے کہ مہر زیر سحاب دیکھا
نہیں ہے دھوکا کچھ اس میں اے دل کہ ہے یہ دھوکا طلسم عالم
جو کچھ سنا تھا سو ہے فسانہ جو کچھ کہ دیکھا سو خواب دیکھا

الغرض یہ ان کے کلام کا نمونہ ہے

یہ عہد میرا موضوع نہیں۔ نہ ہی میں اس نوع کی تحقیق کا مرد میدان ہوں۔ تاہم اگر شاہ نیاز سرہندی کا اردو کلام اب تک اردو میں شایع نہیں ہوا ہے تو پھر جس طرح بھی ہو گا میں اسے مرتب کر کے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

پتہ دیکھیے

[illegible]

[illegible]

سالانہ چندہ ... بھیجئے تاکہ سلسلہ جاری رہے

منیجر

ہماری زبان

۲۲ مئی سنہ ۱۹۶۳ء

سہ لسانی فارمولا اور اُردو

اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ شروع جولائی سے ہر ریاست میں ثانوی منزل پر سہ لسانی فارمولا نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ریاستوں کے وزرائے تعلیم کی جو کانفرنس حال میں ڈاکٹر شری مالی کی صدارت میں ہوئی تھی اُس میں طے ہو گیا تھا کہ جدید ہندستانی زبانوں کے ساتھ کوئی کلاسیکل زبان مثلاً سنسکرت شامل نہ ہوگی، ہندستانی ہندمیں لازمی طور پر جنوبی ہند کی کوئی زبان رکھی جائے گی، بلکہ علاقائی یا مادری زبان اور انگریزی کے علاوہ کوئی جدید ہندستانی زبان لی جاسکے گی۔ جن لوگوں کی مادری زبان اُردو ہے وہ اس طرح اپنی مادری زبان کے علاوہ علاقائی زبان اور انگریزی لے سکتے ہیں جن کی علاقائی اور مادری زبان ہندی ہے وہ انگریزی کے علاوہ اُردو یا کوئی اور جدید ہندوستانی زبان لے سکتے ہیں۔ اگر اس فارمولے پر ان تصریحات کی روشنی میں عمل کیا گیا تو اُردو دوستوں کی ایک بہت بڑی شکایت دور ہو جائے گی۔

اُتر پردیش کے وزیر تعلیم نے دہلی کی کانفرنس میں یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ سنسکرت جیسی کلاسیکل زبان، جدید زبانوں کے بجائے نہیں لی جا سکتی۔ مگر اخباروں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ چونکہ اُتر پردیش میں سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے کے تحت لانے کی خاصی زوردار کوشش ہو رہی ہے اس لئے مرکز کے وزیر تعلیم بھی اس معاملے میں کچھ بے بسی محسوس کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ چونکہ ثانوی تعلیم زیادہ تر غیر سرکاری اداروں کے ہاتھ میں ہے اس لئے ان کی کوشش کامیاب ہو جائے اور سنسکرت ہندی اور انگریزی کے ساتھ عام طور پر پڑھانے کا انتظام کر دیا جائے۔ ہماری رائے میں یہ سہ لسانی فارمولے کی اسپرٹ اور ریاستی وزرائے تعلیم کے فیصلے کی صریحاً خلاف ورزی ہوگی ثانوی تعلیم کی منزل پر مادری زبان کا حق سب سے پہلے ہے۔ جن لوگوں کی مادری زبان اُردو ہے، وہ اُردو کے علاوہ علاقائی زبان ہندی ضرور لیں گے اور انگریزی بھی لیں گے: اس طرح اُردو کے لئے بڑے پیمانے پر انتظام ہونا چاہئے، خوش قسمتی سے ابھی خاصی تعداد میں ایسے اُستاد موجود ہیں جو اُردو پڑھا سکتے ہیں۔ صرف کتابوں کی تیاری کے لئے مناسب انتظامات جلد سے جلد کرنے ہوں گے۔ جن لوگوں کی مادری زبان ہندی ہے جو اُتر پردیش کے علاوہ راجستھان، بہار اور مدھیہ پردیش کی علاقائی زبان بھی ہے وہ ہندی کے علاوہ انگریزی اور کوئی اور جدید ہندستانی زبان لے سکتے ہیں۔ یہ ان جدید ہندوستانی زبانوں میں اُردو کو ایک اہم مقام حاصل ہے اور ہر ریاست میں ایسے طلبہ ضرور ہوں گے جن کی مادری زبان ہندی ہے مگر جو دوسری جدید ہندوستانی زبان کے ذیل میں اُردو لے سکتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی اور پیچ تو پیدا نہیں کیا جاتا۔ اس وقت انجمن کی شاخوں، اُردو کے اداروں، قومی کارکنوں اور اُردو دوستوں، سب کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں متعلقہ کارکنوں کو سہ لسانی فارمولے کے اس طرح نفاذ پر مائل کریں کہ اُردو کا حق مارا نہ جائے۔ اصول سامنے آ گیا ہے۔ عمل کی دُنیا میں اس اصول کا نفاذ کرانا ہے۔ یہ کام ہماری پوری توجہ چاہتا ہے۔ مرکزی انجمن اس سلسلے میں مناسب اقدامات تو کرے گی ہی، ریاستی شاخوں کو بھی سرگرم عمل ہونا چاہئے اور اپنی بیداری کا ثبوت دینا چاہئے۔

سیر بین

آج کل بعض مشہور معاصرین کے متعلق خاص نمبر نکالنے کی ہوا چلی ہے۔ پاکستان میں افکار نے جوش نمبر نکالا اور اب اُس کے بعد حفیظ نمبر نکال رہا ہے۔ ایک رسالہ فیض نمبر کا اعلان کر چکا ہے۔ نگار پاکستان نے نیاز نمبر حصہ اوّل شائع کر دیا۔ اب دوسرا حصہ بھی شائع ہونے والا ہے۔ نگار رام پور کیوں پیچھے رہتا۔ اُس نے ذاکر نمبر کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کے شائع کرنے کے بعد اس کا ارادہ رشید صدیقی نمبر نکالنے کا بھی ہے۔

ہمارے خیال میں مشہور و معروف معاصرین کے کارناموں کی اہمیت کو نمایاں کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ اس سے تو یہ بہتر ہوتا کہ جوش، نیاز، فیض، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی پر اچھی کتابیں لکھی جاتیں اور اُن کی سیرت شخصیت کے ساتھ اُن کی علمی و ادبی خدمات پر سیر حاصل بحث ہوتی۔ خاص نمبر میں خاص مضمون تو چند ہی ہوتے ہیں، زیادہ تر جذباتی اور سرسری ہوتے ہیں، یا ان میں مختلف ادیبوں کے پچھلے مضامین کے ضروری اقتباسات دے دیئے جاتے ہیں۔ اپنے بزرگ معاصرین کی گراں قدر خدمات کا اعتراف اچھی بات ہے، مگر قدر شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی شخص سارا مواد فراہم کر کے ایک اچھی کتاب لکھے، رطب و یابس جمع کر کے خوش ہو لینا، نہ ان مشاہیر کے ساتھ انصاف ہے نہ ادب کی کوئی بڑی خدمت۔ ہاں اس سے شخصیت پرستی کا

میلان ترقی کرتا ہے جو مُضر بھی ہو سکتا ہے۔

اگر ان شاعروں کو طبع آزمائی کے لئے کوئی اچھا مصرعہ طرح نہیں ملتا تو چند عنوانات ہم دیئے دیتے ہیں:

خلا میں پرواز اور اس کے سماجی اور تہذیبی اثرات۔
جدید ہندوستانی زبانوں کے شاہکاروں کے تراجم۔
وجودیت کا فلسفہ، جدید انگریزی، امریکن، روسی، جرمن فرانسیسی، عربی، فارسی، جاپانی ادب، فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تہذیب پر اثرات۔ بنگالی، تامل، مرہٹی، ہندی، ملیالم اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں نئے ادبی میلانات۔
لوک گیت، فنونِ لطیفہ اور ادب، سنسکرت ادب کا مستقبل۔
ایٹمی توانائی اور اس کے امکانات، سائنس کا ادب پر اثر۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ دہلی

۱۱ مئی کی شام کو انجمن ترقی اُردو شاخ دلّی کی ادبی نشست کا پروگرام "شامِ افسانہ" پیش کیا گیا۔ بیگم صالحہ عابد حسین، پرکاش پنڈت، انیس مرزا اور حمیدہ سلطان نے اس پروگرام میں حصہ لیا۔

انیس مرزا نے افسانہ "روشنی کا مینار"، پرکاش پنڈت کا افسانہ "چاندی کے کرشمے"، حمیدہ سلطان کا افسانہ "عہد کے چار رُخ" پیش کیا۔ پنڈت سندر لال، صدر انجمن ترقی اُردو شاخ دہلی نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ (اسسٹنٹ سکریٹری)

انجمن ترقی اردو گلبرگہ

مولوی محمد عبدالوہاب صاحب ایڈوکیٹ منتخب صدر نے حسب ذیل حضرات کو ۶۳ء-۱۹۶۴ء کے لئے اراکین عاملہ نامزد کیا ہے۔

برکت الحق صاحب قریشی، آر۔ ایم۔ اے لکچرار (نائب صدر) سید خورشید حسن صاحب ایڈوکیٹ (معتمد)۔ بھوج راج صاحب ایڈوکیٹ (شریک معتمد)۔ امیر علی صاحب سہروردی ایڈوکیٹ (خازن)۔ محمد عبدالرحیم صاحب آزاد ایڈوکیٹ۔ شیر خاں صاحب (ایم پی)۔ دھرم راؤ صاحب افضل پورکر ایڈوکیٹ۔ محمد حسن خاں صاحب۔ عزیز الحسن صاحب شور عابدی۔ حاجی محمد عبدالرزاق صاحب مینار سوداگر۔ عبدالغنی صاحب افسر۔

مجلس مصنفین مدراس

مجلس مصنفین مدراس کی ایک تنقیدی نشست جناب سہیل رفیعی کی صدارت میں ۲۸ اپریل کو منعقد ہوئی۔ صدارتی تقریر میں جناب رفیعی نے مجلس کے جدید فکر رکھنے والے اراکین کی یکجائی و یک جہتی اور مجلس کے صحت مند منصوبوں پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے تنقیدی نشست کا آغاز فرمایا۔

اُردو ہند اور ایران کی مشترکہ بولی ہے

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جو ایران کے ۹ روزہ دورے پر تشریف لے گئے تھے ایک تقریب میں ہندوستان اور ایران کے پُرانے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایران پر ہندوستانی آرٹ، عمارتوں کی تعمیر کا فن، موسیقی اور مصوری کا اثر بہت زیادہ ہوا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ "ہمارے ملک کے بہت سے حصّوں میں ایک مشترکہ ہند ایرانی زبان بولی جاتی ہے جس کو اُردو کہتے ہیں۔"

انجمن ترقی اُردو شاخ بمبئی

جامعہ اُردو علی گڑھ کے امتحانات کو فروغ دینے اور بمبئی سے شریک ہونے والے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے انجمن ترقی اُردو بمبئی نے اس سال رجسٹرار صاحب جامعہ اردو کی اجازت سے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ جامعہ اُردو کے امتحانات ماہ نومبر ۶۳ء میں ہوں گے جو لوگ ان علوم مشرقی کے نہایت اہم اور مفید امتحانات میں شریک ہونا چاہیں وہ مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳ سے قواعد و ضوابط اور دیگر معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ (اعجاز صدیقی)

اڑیسہ کے اُردو شاعر کے لئے سرکاری وظیفہ

اڑیسہ کے کہنہ مشق اُردو شاعر حضرت امجد نجمی صاحب کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے مشترکہ طور پر اکتوبر ۱۹۶۲ء سے چھ سو روپے سالانہ بطور وظیفہ مقرر کیا ہے۔ نجمی صاحب اڑیسہ کے پہلے اُردو شاعر ہیں جن کو اس طرح کا وظیفہ ملا ہے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں آپ کا شعری مجموعہ "طلوعِ سحر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب کے زیرِ اہتمام ۱۳ اپریل ۶۳ء کو بیجا ستر بچار سمیتی اٹک کی جانب سے اڑیا زبان کی جو سالانہ کانفرنس "دشوب ملن" منعقد ہوئی تھی اور مرکزی وزیر ڈاکٹر ہمایوں کبیر صاحب نے جس کی صدارت کی تھی، اس میں جہاں اڑیا کے دیگر ادیبوں کی عزت افزائی کی گئی وہیں امجد نجمی صاحب کو بھی اعزاز نامہ نیز انعام و اکرام سے نوازا گیا۔
(سکریٹری بزم سخن اڑیسہ)

مجاز لائبریری

مجاز لائبریری کا سالانہ جلسہ منور علی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سکریٹری کی رپورٹ اور سالانہ حساب متفقہ رائے سے منظور کئے گئے۔ سال رواں کے لئے مندرجہ ذیل عہدیداران منتخب ہوئے۔

صدر: جناب منور علی صاحب۔ نائب صدر: جناب پرستم بھائی۔ سکریٹری: جناب زوار حسین صاحب احمر۔ جوائنٹ سکریٹری: جناب نظام الدین صاحب۔ خزانچی: جناب عدالت پرشاد صاحب ستاستری۔ لائبریرین: جناب نفیس صاحب دھام پوری۔ (مجاز سکریٹری)

متین سروش

عہد نامہ

مادرِ ہندوستاں
مادرِ ہندوستاں
تیری پاکیزہ محبت کی قسم
عہد نامہ خون سے لکھتے ہیں ہم
سرنگوں ہونے نہ دیں گے پرچم ہندوستاں
خون سے سینچیں گے ہم یوں حریت کا گلستاں
زندگی پائے گی جس سے تو بہ نو عزم جواں
جھوم اٹھیں گے مسرت سے زمین و آسماں
مادرِ ہندوستاں
مادرِ ہندوستاں
تیری پاکیزہ محبت کی قسم
عہد نامہ خون سے لکھتے ہیں ہم
ارتقا کے راز داں اٹھتے ہیں بہ عزم آتشیں
ہم نے چھیڑا ہے ربطِ ہستی بہ صد ناز یقیں
حوصلوں نے چوم لی بڑھ کر ارادوں کی جبیں
اب چراغ آرزو کوئی بجھا سکتا نہیں
مادرِ ہندوستاں
مادرِ ہندوستاں
تیری پاکیزہ محبت کی قسم
عہد نامہ خون سے لکھتے ہیں ہم
حریت کے ساز پر نغمے وفا کے گائیں گے
منزلیں مشکل سہی آگے ہی بڑھتے جائیں گے
جوہرِ تیغ شجاعت اس طرح چمکائیں گے
ہم زمانے میں رسول دوستی کہلائیں گے
مادرِ ہندوستاں
مادرِ ہندوستاں
تیری پاکیزہ محبت کی قسم
عہد نامہ خون سے لکھتے ہیں ہم

عادل منصوری

ایک نظم

خواہش کے لال سمندر کی
گر اک اک بوند کو چیرا جائے
تو اس میں سے
درد کا اک اک
کالا سورج
باہر آئے

شہاب قاضی پوری

یاد

شعلہ سا جل رہا ہے سینے میں زندگی کے
یا تم نے دور جا کر
پھولوں سے خار چن کر
احساس کی رگوں میں کانٹا چبھو دیا ہے
تا کہ حیات میری
کانٹوں کی اس چبھن میں پھولوں کو بھول جائے
ممکن نہیں ہے لیکن
کانٹوں کی اس چبھن سے شعلوں کے اس جلن سے
لاچار ہو کے اک دن
آہوں سے پھونک ڈالوں
اپنی وفا کی شمع
جو دل کی خلوتوں میں مدت سے جل رہی ہے
اور یاد بن چکی ہے۔

غزلیں

دورؔ آفریدی

دل کے سازوں پر گیت گائے تھے — سننے والے مگر پرائے تھے
بہہ رہی ہیں نشاط کی ندیاں — کیا اشارے تھے کیا کنائے تھے
میں نے چاہت کے آسماں پر دوست — چاند تاروں کے دف بجائے تھے
ہائے وہ دن جو تیرے ساتھ گئے — نغمہ و نور میں نہائے تھے

جے کرشن چودھری حبیبؔ

یاد ایامِ رفتہ یوں آئے — دھندلے دھندلے سے جیسے کچھ سائے
جیسے اڑتے ہوئے پرندے کا — نغمہ دم بھر فضا میں لہرائے
جیسے ویران دل کے گلشن میں — چپکے چپکے بہار آ جائے
سونی سونی سی جیسے محفل میں — دفعتاً جانِ انتظار آئے

قیسؔ رام پوری

رازِ ہستی یوں بھی سمجھایا گیا — سوئے مقتل میں بھی لایا گیا
مہربانوں کے دلاسوں پر نہ جا — دل کو اکثر یوں بھی بہلایا گیا
جب کوئی دریا اڑا اسے قہقہے — ہم میں اک یہ بھی جنوں پایا گیا
قیس پھر ساغر بکف اٹھا کوئی — پھر مری توبہ کو ٹھکرایا گیا

راشد اللہ خاں جوہرؔ (برار)

تصورِ رخِ جاناں کی داستاں لکھوں — کہ بزمِ دل کے چراغاں کی داستاں لکھوں
ذرا جو چھیڑ بھی لیتے ہیں مرے شوقِ نظارہ — حجاب بنتے نگاہوں کی داستاں لکھوں
میں اپنے خانۂ گلکار کا فسانہ کہوں — کہ ان کے حسن فزوں کی داستاں لکھوں
کسی کی کم نگہی کا گلہ کروں جوہرؔ — کہ صد جراحتِ پنہاں کی داستاں لکھوں

ایم۔ اے حسن، کچھپہروی

ہندی الفاظ کا تلفظ

ہر ملک کا اپنا خاص ماحول، اپنی مخصوص زبان اور اپنا الگ رسم الخط ہوتا ہے۔ اس لئے دنیا کی کسی بھی زبان میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ہر زبان کے الفاظ کو پوری صحت کے ساتھ بول سکے۔ اپنے ہی ملک کی قومی زبان یعنی ہندی کو دیکھئے۔ یہ گز، خط، غم، قلم اور فیصل وغیرہ جیسے عام فہم اور کثرت سے استعمال ہونے والے الفاظ کو گج، کھت، گم، کلم اور پھیسل بولتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ کھیل، گھڑا، جل، پڑھنا اور جڑ وغیرہ جیسے روزمرہ کی بول چال والے اپنے ہی الفاظ کو جل، گھڑا، جل، پڈھنا اور جڈ لکھتی ہے لیکن ہم اپنی سوجھ بوجھ سے ان کا صحیح تلفظ کر لیتے ہیں۔

عربی اور فارسی کو دیکھئے۔ یہ بھات، پھل، چھت، گھر اور پڑھ وغیرہ جیسے معمولی الفاظ کو نہیں لکھ سکتی۔ انگریزی کا تو پوچھنا ہی کیا ہے اس میں بھی اردو کے ت، خ، د اور غ وغیرہ کا تلفظ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ اپنے ہی لفظ PUT کو پُٹ لیکن اسی وزن پر BUT کو بَٹ پڑھتی ہے۔ مطلب یہ کہ انگریزی کا ایک ہی اعراب ایک جگہ اور تو دوسری جگہ کچھ اور تلفظ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی عبارتوں کو ہجے دیکھ کر صحیح صحیح پڑھا نہیں جا سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ایک زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو فراخدلی سے نہیں اپناتی اور اگر اپناتی بھی ہے تو انھیں بگاڑ کر بولتی ہے۔

لیکن یہ اردو ہی ہے کہ مذکورہ بالا تمام الفاظ کو پوری صحت کے ساتھ لکھ پڑھ سکتی ہے۔ یہ چھوا چھوت کی قائل نہیں ہے ان تمام الفاظ کو بے دریغ اپنا لیتی ہے جو عوام کے ٹکسال گھر میں ڈھلتے رہتے ہیں۔ آج کثرت سے ہندی، فارسی، انگریزی اور عربی زبانوں کے ہزاروں الفاظ اردو میں استعمال ہو رہے ہیں۔

پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زبان میں بھی اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ یہ سنسکرت اور انگریزی کے تمام الفاظ کو پوری صحت کے ساتھ پڑھ سکے۔ آج ملک میں بڑی تیزی کے ساتھ ہندی کے اصطلاحی اور غیر اصطلاحی الفاظ کا چلن بڑھ رہا ہے۔ عوامی زبان ہونے کی حیثیت سے اس طرح کے تمام الفاظ کو اردو اپنانے لگی ہے۔ قومی یکجہتی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق یہ اپنے رسم الخط میں ہندی، بنگلہ، تیلگو اور تامل وغیرہ زبانوں کی اچھی اچھی کتابوں، اخلاقی لوک گیتوں اور کہانیوں کو لکھنے لگی ہے۔ لہٰذا اب اردو میں اتنی صلاحیت لازمی طور پر ہونی چاہئے کہ یہ کم از کم اپنے ہی ملک میں بولے جانے والے تمام الفاظ کو پوری صحت کے ساتھ لکھ پڑھ سکے۔ یہ کام اردو کیلئے مشکل نہیں ہے۔ ذرا سی اصلاح کے بعد بڑی آسانی سے ہم ایسا کر سکتے ہیں۔

اسی عظیم مقصد کے تحت میں پچھلے کئی برسوں سے مسلسل جدوجہد کر رہا ہوں۔ میں نے ہندی اردو اعرابوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے اپنی تجویز پیش کر دی ہے۔ اور آج یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم کس طرح ہندی کے بقیہ مخصوص حروف کا اردو میں حق ادا کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہندی اردو اعرابوں اور حروف تہجیوں میں مطابقت پیدا ہو جائے گی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندی کے الفاظ کو نہیں لکھ پڑھ سکیں۔

ہم ہندی الفاظ کو صرف صحت کے ساتھ بولنا ہی نہیں چاہتے بلکہ کتابت میں بھی ہندی الفاظ کے ہجے کا خیال رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ہم ہندی پڑھ کر اردو یا اردو پڑھ کر ہندی آسانی سے سیکھ لیں۔ ہندی حروف تہجی پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ خوش قسمتی سے ہندی کے تمام حروف اردو میں شامل ہیں۔ صرف ङ، ञ، ण، क्ष، त्र، ळ، ष، اور ऋ آٹھ حروف ایسے ہیں جن کا اردو میں تلفظ نہیں ہو سکتا۔ میں ان کے لئے نئے نئے حروف ایجاد کر کے اردو کی فہرست اور لمبی بنانا نہیں چاہتا بلکہ موجودہ حروف کو ہی ملا جلا کر کام چلانا چاہتا ہوں۔

ہندی کے ङ، ञ، ण، म اور न نون غنہ اور نون ساکن کا کام کرتے ہیں۔ وہ بھی صرف خاص خاص موقعوں پر یعنی جب क، च، ट، त یا प کنبہ کے کسی حرف کے پہلے اگر نون غنہ یا نون ساکن آتے ہیں تو انوسوار (نون غنہ) کے بدلے اسی کنبہ کے پانچویں حرف (ङ، ञ، ण، न، म) کی نصف صورت ہی لکھتے ہیں جیسے بنگال बङ्गाल، پنچایت पञ्चायत، بھنڈار भण्डार، کُنبہ कुम्बा، اور کندھا कन्धा وغیرہ۔ مگر اب ہندی बंगाल، पंचायत، भंडार اور कंधा لکھنا بھی صحیح مانتی ہے۔ اس لئے ان کی نصف صورتوں کے لئے اردو میں کوئی علامت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کا کام صرف نون ساکن اور نون غنہ سے ہی لیا جا سکتا ہے اور اچھی طرح گمان کیا جا سکتا ہے کہ کن حالتوں میں نون غنہ کے بدلے ہندی کے کون سے حرف کی نصف صورت لکھی جاتی ہے۔ البتہ म اور न اردو کے م اور ن کے قائم مقام ہیں۔

ہندی میں پورے ङ اور ञ کا استعمال بالکل نہیں ہوتا پورے "ण" کا استعمال بھی ہندی میں بہت کم ہوتا ہے۔ پھر بھی پورے ञ اور ण کا اردو بدل مقرر کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ ञ میں ي (य) + ں (نون غنہ) کی اور ण میں ں (نون غنہ) اور "ڑ" کی آوازیں ملی ہوئی ہیں اس لئے میری تجویز ہے کہ انہیں ترتیب وار ي + ں = يں اور ں + ڑ = ڑں لکھا جائے جیسے पोषण پوشڑں، ण = ڑں وغیرہ۔ اگر ہم اس تجویز کو مان لیں گے تو اب سے جہاں کہیں يں اور ڑں کی نئی ترتیب اردو عبارتوں میں دیکھیں گے ان کا ہندی کے ٹھیک ञ اور ण کی طرح تلفظ کریں گے۔

ہندی ष اور ऋ دو حروف ہیں۔ "ष" کا تلفظ اردو کے ٹھیک "ش" یا کہیں کہیں "کھ" کی طرح کیا جاتا ہے اس لئے اس حرف کا کام اردو کے "ش" سے لیا جائے یا اگر کتابت میں بھی ہندی کے "ष" کا اظہار مقصود ہو تو "ش" کے بالائی ایک نقطہ کے بدلے "ط" لکھا جائے یعنی पो + ष + ण = پو + شؕ + ڑں یعنی पोषण = پوشؕڑں۔

ऋ سنسکرت کا ایک مخصوص حرف علت ہے۔ پورے "ऋ" کا استعمال ہندی میں راقم الحروف کو صرف ऋषि، ऋतु اور ऋण کے ساتھ ہی ملا ہے۔ ہاں البتہ اس کی ماترا کا استعمال ہندی میں کثرت سے ملتا ہے۔ پورے "ऋ" کا اردو بدل "رِ" مقرر کرنا بہت سائنٹفک ہے کیونکہ اس سے "ऋ" کے تلفظ کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اگر زیر کے بدلے ऋ کو

'ر' لکھا جائے تو اس سے ہندی کے 'रि' کا بھی گمان ہو سکتا ہے۔ 'ऋ' کی ماترا کو حرف کے نیچے 'ر' لکھ کر ظاہر کیا جائے یعنی कि = کِ لیکن कृ = کْ اور اس طرح कृपा = کرپا، मृगा = مرگا، ऋतु = رُت، ऋणा = رن اور ऋषि = رشی یا رِشی وغیرہ۔

ہندی کے क्ष، त्र اور ज्ञ مرکب حروف ہیں۔ क्ष کو क + ष، त्र کو त + र اور ज्ञ کو ज + ञ ملا کر بنایا گیا ہے۔ چنانچہ اگر ہندی انہیں ترتیب وار क्ष، त्र اور ज्ञ لکھتی تو اصولاً بالکل صحیح ہوتا اور اس طرح ہندی کو خواہ مخواہ یہ تین حروف فاضل نہ رکھنے پڑتے۔

اُردو میں ان کے لئے مخصوص حروف بنانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ جن حروف کو ملا کر بنائے گئے ہیں ان کو ہی ساکن حروف علامت (ٗ) سے ملا کر ان کا اُردو متبادل بنا دیا جائے۔ جیسے کْ + ش = کش یا کْش، تْ + ر = تر لیکن گْ + یَ (ی) = گیَ (کیونکہ ہندی کا ज्ञ گرچہ ज + ञ کے ملنے سے بنا ہے لیکن اس کا تلفظ اس طرح کیا جاتا ہے (گویا یہ ग اور य کو ملا کر بنایا گیا ہو) اس لئے بموجب تجویز ہذا क्षा = کْشا، क्ष = کْش، क = ک اور शिक्षक = شکْشک۔ प = پ، री = ری، क्षा = کْشا اور परीक्षा = پریکْشا۔ यज्ञ = یگیَہ یا یگیہ، त्र = تر اور यात्रा = یاترا۔ प = پ، त्र = تر اور पत्र = پتر۔ वि = وِ، ज्ञा = گیا، न = ن اور विज्ञान = وگیان وغیرہ۔ واضح رہے کہ क्ष اور ष کا تلفظ مختلف مقامات پر مختلف کیا جاتا ہے۔ اس لئے ان کا جس مقام پر جو تلفظ ہوگا۔ اُردو داں ان کی متبادل اردو صورتوں کا وہی تلفظ کریں گے۔

لیجئے سارا مرحلہ ختم ہو گیا اب ہم مذکورہ بالا اصول کو مان کر پوری صحت کے ساتھ اُردو میں ہندی اور سنسکرت کے تمام الفاظ لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ آپ کو کہیں کہیں حروف کی اجنبی ترتیب ضرور ملا کرے گی اور آپ کو یہ سمجھنا پڑے گا کہ اس اجنبی ترتیب سے کیا مراد ہے۔ آپ صرف چند منٹوں میں اتنی باتیں ذہن میں جما سکتے ہیں۔ ہمارے بچوں کے لئے تو اتنی دقت بھی نہیں ہوگی۔ جو تھے درجے سے جب ہم انہیں ہندی پڑھائیں گے اس نئی ترتیب کا اردو کتابوں میں بھی لحاظ رکھیں گے یعنی ایسا انتظام کریں گے کہ کچھ علامتیں (ٗ، ٖ) ہم الٹے حروف پر بٹھا سکیں۔

میں نے پچھلے مضامین میں اعرابوں اور علامتوں کا استعمال بہت حد تک کم کر دیا ہے۔ ذ، ڈ کا کام اب ہم صرف 'ذ' سے لے کر دو حرف اپنی فہرست سے کم کر دینا چاہتے ہیں۔ 'ھ' ء اور ے کو حروف تہجی سے نکال کر ان میں سے اول الذکر دو کو (ھ، ء) علامتوں اور موخر الذکر ے کو اعرابوں کی فہرست میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے کبھی بتایا تھا کہ 'ھ' کو ہم نہیں کہہ کر علامت ہندی کہا جائے اسی طرح علماء نے یہ بھی بتایا تھا کہ 'ء' حرف نہیں ہے بلکہ تشدید (ّ) کی طرح ایک علامت ہی ہے لیکن جب کسی حرف میں (ی، ے، و) اس کی ذات کا ہی اعراب (ی، ے، و) لگتا ہے تو ان کو ملا کر نہیں لکھ کر صرف 'ء' سے ظاہر کرتے ہیں جیسے کٔ + ی = کی لیکن یٔ (ऐ)، ی = یٔ، کٔ + ے = کے، لیکن ے + ے = ئے، کٔ + و = کو (को) لیکن و (ओ) + و (औ) = وٗ جیسے کھاؤ، وغیرہ۔

غور کیجئے اگر ہم ہندی اُردو اعرابوں اور حروف تہجیوں کا مجوزہ اُردو متبادل مان لیں تو کل کی اُردو یقینی طور پر آج کی اُردو سے سہل ہوگی۔ اس کا چہرہ مہرہ ۹۹ فی صدی برقرار رہے گا اس کی عبارتوں کو قطعی طور پر وہی جائے گا جو لکھا ہوگا، ہم اپنی مروجہ کتابوں کو پڑھ سکیں گے، ہندی بنگلہ اور تیلگو وغیرہ زبانوں کی کتابوں کو صحت کے ساتھ اُردو میں لکھ سکیں گے اور اس کے لئے ہمیں حروف کی صرف ۲ (ڈ، ڑ) اور علامتوں کی (۲) اجنبی صورتیں ہی مقرر کرنی پڑیں گی۔ ان اجنبی صورتوں سے ہم آج بھی کم و بیش واقف ہی ہیں۔ ان کی سائنٹفک ترتیب سے ان کی آوازوں کا گمان آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہندی اُردو اعرابوں میں بھی ربط پیدا کرنے کے لئے میں نے کوئی اجنبی یا ناقابل فہم تجویز پیش نہیں کی بلکہ دو نقطوں کی ایسی ہی ترتیب رکھی ہے جیسا کہ ہم عام تحریر میں رکھا کرتے ہیں۔ ذیل میں ہندی اعرابوں اور حروف تہجیوں کا اُردو بدل پیش کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین اس کے متعلق اپنا آخری فیصلہ قائم کر سکیں۔ میں اب ان کی مزید تفصیل پیش نہیں کر سکتا۔ میں اپنے تمام پچھلے مضامین میں ان پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ اصول اتنا سہل اور قابل عمل ہے کہ بلا خوف و خطر آج ہی سے اس پر عمل ہو سکتا ہے اور فارسی رسم الخط استعمال کرنے والے دوسرے ممالک بھی اس پر عمل کر سکتے ہیں۔

اعراب: अ = اَ، आ = آ، इ = اِ، उ = اُ، ई = اِی، ए = اے، ऐ = اَے، ओ = او، औ = اَو، ऊ = اُو، یعنی अब = اَب، आम = آم، दिन = دِن، दुम = دُم، दीन = دین، देन = دین، दैन = دَین، दो = دو، दौड़ = دَوڑ، दूर = دُور، दँग = دنگ، अतः = اتہ، मृगा = مرگا، करा = کرن وغیرہ۔

یہ اس سلسلے کا آخری مضمون ہے
(ادارہ)

مراسلات

فرزند علی اخگر عظیم آبادی

مصنف "تلامذۂ غالب" جناب مالک رام صاحب نے مولوی فرزند علی عظیم آبادی متخلص بہ اخگر کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ موصوف مرزا پور میں وکیل عدالت تھے اور ان کی ایک غزل کا صرف ایک شعر ؎

(۱) خود نما تھا سب حسینان زمن میں آئینہ | ہے مگر حیران تیری انجمن میں آئینہ
درج فرمایا ہے۔ (ص ۲۹ تلامذۂ غالب)

مرزا کلب حسین خاں متخلص بہ نادر نے اخگر مرحوم کی اسی غزل پر اپنے دیوان غریب ۱۲۸۳ھ میں اپنا خمسہ درج فرمایا ہے۔ اس خمسہ میں اس غزل کے پانچ اشعار پائے جاتے ہیں جو ناظرین "ہماری زبان" کی تفریح طبع کے لئے حاضر ہیں۔

مولوی فرزند علی صاحب اصل باشندہ موضع یوسف پور محلات عظیم آباد کے تھے اور موصوف نے مرزا پور میں توطن اختیار کر لیا تھا۔ مولوی فرزند علی کے خاندان کے لوگ ابھی تک مرزا پور ہی میں توطن اختیار کئے ہوئے ہیں اور وہاں بڑی عزت کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔

مرزا کلب حسین خاں نادر نے اپنے اور دوسرے شعرائے فارسی اور اردو کے کلام پر جو خمسے لکھے ہیں انہیں خمسوں کے مجموعے کا نام "دیوان غریب ۱۲۸۳ھ" ہے۔ پوری کتاب بڑی تقطیع کے ۵۲۲ صفحوں پر محیط ہے اور صفحہ ۵۶۳ سے ۵۷۹ تک میں دیوان غریب پر متفرق حضرات کی لکھی ہوئی نظم و نثر میں تقریظیں ہیں۔

حضرت اخگر کی غزل کا مطلع اوپر درج ہو چکا ہے۔ غزل کے بقیہ اشعار درج ذیل ہیں۔

(۲) گرمیِ آہ شرربار دلِ مغموم سے | شعلۂ جوالہ ہے بیت الحزن میں آئینہ
(۳) عکس عارض جلوہ افزا ہی جو پشت آئینہ میں | صاف ہے آیا تصور ہے لگن میں آئینہ
(۴) لاکھوں جتنے اے خود آرا آہ عاشق سے کیے | پر کسی دن بھی تو اس کی انجمن میں آئے نہ
(۵) فن کی شاگردی جو اے اخگر ہوئی مد نظر | ہو گیا استاد مجنوں کے فن میں آئینہ

(محمد بشیر الحق دسنوی)

"پوزیشن" مونث ہے یا مذکر

"پوزیشن" انگریزی لفظ ہے۔ بمعنی حیثیت وغیرہ۔ اردو نے اس کو اپنا لیا ہے اور بالعموم مونث استعمال ہوتا ہے مگر بعض صاحبان اس کو مذکر مانتے ہیں مثلاً

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی نے سید ل محمد فضا کے استفسار پر اس کو مذکر مانا ہے اور ثبوت میں اپنا یہ مطلع لکھا ہے۔

خیال رکھتا ہے جو آدمی پوزیشن کا
وہ دل کا داغ سمجھتا ہے داغ دامن کا

نیز نواب وقار الملک مرحوم نے ۱۴ راگست ۱۹۰۱ء کے مکتوب اسمی مولوی بشیر الدین احمد صاحب میں لکھا ہے

"جو کچھ جواب میں ان کو دے سکوں گا وہ صرف میری ذاتی رائے ہوگی اور بہت کمزور مسلک اور فانس پوزیشن ہوگا"

لہذا کیا اس کو مذکر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ (تجلی عثمانی - جے پوری)

"پوزیشن انگریزی لفظ ہے جو اردو لفظ جگہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جگہ مونث ہے اس لئے پوزیشن بھی مونث استعمال کرنا چاہیئے۔ انگریزی الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں حضرت سائل مرحوم سند نہیں بنائے جا سکتے" (ادارہ)

بیدل اجمیری

"تذکرہ شعرائے جے پور" (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) کے مرتب نے حضرت بیدل اجمیری کے مختصر حالات کے ساتھ انھیں بلا سند و روایت حضرت بہار اجمیری کا شاگرد بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو "تذکرہ شعرائے جے پور" کی مندرجہ ذیل اصل عبارت:

بیدل تخلص۔ محمد نور خاں نام۔ شمس آباد کے رہنے والے تھے۔ پھر اجمیر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حکیم بہاء الدین خاں بہار سے تلمذ تھا۔" (تذکرہ شعرائے جے پور صفحہ ۱۲۶)

دراصل یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ ملاحظہ ہو حضرت سید اکبر حسین صاحب اکبر اجمیری کا مندرجہ ذیل مضمون:

(نقل مطابق اصل) (آہ بیدل اجمیری)

ملک کا مایۂ ناز شاعر ضمیر الحق محمد نور خاں بیدل افغانی شاعر دربار جاورہ متوطن اجمیر شریف یادگار راقم الدولہ طوطی ہند حضرت ظہیر دہلوی خلد آشیاں۔

۱۴ر جولائی ۱۹۲۷ء مطابق ۱۲ر رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ روز شنبہ ۲ بجے دن پندرہ ماہ کی طویل علالت کے بعد راہی ملک بقا ہوئے۔

مرحوم خاندان ذوق علیہ الرحمہ کے چراغ۔ داغ اور ظہیر کے شاگردان بے شک کی فہرست میں صف اول میں بیٹھنے کا فخر رکھتے تھے اور جاورہ کی اقامت ۴۰ سالہ نے مالوے کی شاعری کو چار چاند لگا دیئے۔

خلاق عالم کی منظوری کہ رتبع شعر آفتاب چمکا اور داستان ہر زبان کی طرح وضعداری علم و ایثار کی روش اور خوبیاں اپنے ساتھ لے کر غروب ہو گیا اس پر آشوب زمانہ میں جبکہ اردو کی جان ناتواں پر چاروں طرف سے اغیار کی یورش ہے ایسی قادر الکلام ہستی کا روپوش ہو جانا نہایت گراں ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل۔ (سید اکبر حسین اکبر چشتی اجمیری)

اس مضمون سے نہ صرف اس کی تردید ہوتی ہے کہ حضرت بیدل کو حضرت بہار سے تلمذ تھا بلکہ حضرت بیدل اجمیری کے صحیح حالات پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ صاحب مضمون سید اکبر حسین اکبر چشتی اجمیری نہ صرف حضرت بیدل اجمیری کے ہم عصر شاعر تھے بلکہ ان کا ساتھ اجمیر سے جاورہ تک قائم رہا۔

یہ مضمون اجمیر سے شائع ہونے والے اخبار "عزیز" کی اشاعت بابت ۲۸ر جولائی ۱۹۲۷ء میں بیدل اجمیری کی وفات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔
(سید فضل المتین)

(بقیہ مراسلات صفحہ ۱۰ کے دوسرے کالم میں)

وریند پرشاد سکسینہ بدایونی

مولوی عبدالحی تجوّد بدایونی مرحوم

مولوی عبدالحی تجوّد بدایونی مدینۃ الاولیاء بدایوں کے عباسی خاندان کے فرد تھے۔ آپ کی پیدائش ۸ر ستمبر ۱۸۷۳ء کو بدایوں میں محلہ عباسی میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مولوی غلام سرور تھا لیکن "خمخانۂ جاوید" میں غلطی سے لالہ سری رام نے آپ کے والد کا نام غلام رسول تحریر کیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ ابتدا میں آپ کے والد نے آپ کو عربی فارسی پڑھانے کے لیے بدایوں کے ممتاز اساتذہ کو مقرر کیا لیکن آپ کی آزاد مزاجی کی وجہ سے آپ کی تعلیم مکمل نہ ہوسکی۔ آپ کو ابتدا سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا۔ ۱۳۰۹ھ میں جب آپ کے والد کا انتقال ہوگیا تو آپ کی آنکھیں کھلیں اور آپ نے ۱۸۹۷ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور کئی سال تک بدایوں، شاہجہاں پور، بریلی اور پیلی بھیت میں وکالت کی لیکن آپ کو وکالت میں فانی بدایونی کی طرح کوئی کامیابی نہیں ہوئی کیوں کہ آپ کا سارا وقت شعر و شاعری ہی میں گزر جاتا تھا۔ ریاست سرودہی اور ریاست جودھ پور میں ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ ایک مقطع میں سرودہی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

سرو گردن کی خبر ہو جے تجوّد نام اس شہر کا سرودہی ہے

اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جودھ پور میں اچانک بیمار ہوئے اور اپنے پیارے وطن بدایوں کو دیکھنے کی تمنا اپنے لڑکوں سے ظاہر کی۔ لڑکوں نے آپ کو بدایوں بھیج دیا اور عباسی محلہ میں اپنے ہی مکان میں نومبر ۱۹۲۸ء کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا، اور بدایوں ہی میں حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے بیرونی چبوترے پر دفن ہیں۔ تجوّد بدایونی نے سب سے پہلے مولانا الطاف حسین حالی سے مشورہ سخن کیا اس کے بعد مذاق میاں بدایونی کے شاگرد ہوگئے لیکن جب داغ کی شاعری کی مقبولیت کو دیکھا تو نواب مرزا داغ دہلوی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ تجوّد جیسے شاعر نے مذاق میاں کی شاگردی کا ذکر اپنے دیوان میں نہیں کیا۔

مولوی فضل اکرم مرحوم نے ۱۸۹۳ء میں مذاق میاں بدایونی کے شاگردوں کا ایک تذکرہ "بہارِ بوستانِ شعر" کے نام سے شایع کرایا ہے اس تذکرہ میں تجوّد کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:-

"تجوّد۔ مولوی عبدالحی خلف جناب مولوی غلام سرور رئیس بدایوں۔ اس وقت عمر ان کی پچیس سال کی ہے صورت نہایت پاکیزہ، سیرت بہت عمدہ، نازک بدن خوش اندام، متانت و ظرافت سے بھرے ہوئے ذہانت و ذکاوت میں خوب چڑھے ہوئے۔ بارہ سال کی عمر سے شوق سخن ہوا اور اکثر دیوان بینی کا شغل رہا، جب شعر کہنا شروع کیا تو خواجہ الطاف حسین پانی پتی کے شاگرد ہوئے جو مرزا غالب دہلوی کے شاگرد رشید ہیں مگر جب انھوں نے شاعری کو ترک کیا تو انھوں نے بھی ان کی شاگردی سے علٰحدہ ہوکر حضرت مذاق اور مرزا داغ کو اپنا استاد بنایا سن اٹھارہ سو ستانوے عیسوی میں امتحان دیا چوں کہ ذہین تھے پہلی دفعہ میں وکالت کی سند پائی۔"

"انتخابِ زریں" کے پہلے ہی اڈیشن میں جو نظامی پریس بدایوں سے شایع ہوا ہے سہرا اس مسعود انیس تجوّد مرحوم کے سلسلے میں فرماتے ہیں:-

"تجوّد۔ مولوی عبدالحی۔ تخلص تجوّد خلف مولوی غلام سرور صدیقی بدایونی ۱۲۹۰ھ مطابق ۸ ستمبر ۱۸۷۳ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی سے بخوبی ماہر تھے۔ دونوں زبانوں میں عمدہ استعداد رکھتے تھے، خوش رو، خوش لباس زندہ دل، رنگین مزاج شاعر تھے۔ اساتذۂ گذشتہ کے ذوقِ سخن سے آشنا ہوکر خود بھی معنی آفرینی کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ سب سے پہلے حضرت حالی کے شاگرد ہوئے آخر میں جناب داغ دہلوی کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔"

بیسیوں حضرات نے آپ سے مشورہ سخن کیا تھا لیکن آپ بھی جگر بریلوی کی طرح استادی شاگردی کے چکر کے قائل نہیں تھے۔ آپ سے مشورہ سخن کرنے والوں میں منشی بیتمبر پرشاد اختر، مولوی رضا حسین بیدل بدایونی اور مولانا نظامی بدایونی زیادہ مشہور ہوئے۔ حاجی عطا محمد عطا بدایونی شاگرد داغ نے بھی آپ سے مشورہ سخن کیا تھا۔ آپ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی بدایوں میں اپنے خاندان میں کی جس سے مولوی رضا حسین بیدل پیدا ہوئے جو ایک اچھے غزل گو اور ریاست جودھ پور میں کسی سکول میں اردو فارسی پڑھاتے تھے۔ کوئی پندرہ سال ہوئے کہ آپ بدایوں سے جودھ پور جا رہے تھے کہ کاسگنج کے اسٹیشن پر انتقال فرمایا۔ آپ کی لاش بدایوں لائی گئی اور یہاں ہی اپنے خاندان کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

دوسری شادی اجمیر میں کی جس کے بطن سے دو لڑکیاں اور پانچ لڑکے پیدا ہوئے۔ اس وقت دو صاحبزادے جن کے نام مصطفٰی حسین اور مجتبٰی حسین ہیں، حیات ہیں۔ لڑکیوں میں سے بھی دونوں لڑکیاں حیات ہیں۔

مرزا داغ ۲ر اپریل ۱۸۹۹ء کو بدایوں تشریف لائے تھے اور عباسی محلہ میں ایک یادگار مشاعرہ مرزا داغ کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس مشاعرہ میں مرزا نے بدایوں کے اہلِ ذوق و ادب کی بہت تعریف کی۔ حاجی عطا محمد عطا بدایونی اور نازش بدایونی کے والد بھی اس مشاعرہ میں مرزا داغ کے شاگرد ہوگئے تھے۔ تجوّد مرحوم نے بھی اس مشاعرہ میں غزل پڑھی تھی، اس مشاعرہ کا گلدستہ شایع ہوا تھا لیکن اب کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔

تجوّد بدایونی کی تصانیف یہ ہیں:-

(۱) "مرآۃ الخیال" تجوّد بدایونی کی غزلیات اور متفرق کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۰۴ء میں مطبع مستنصر پریس دہلی میں باہتمام سید مستنصر علی طبع ہوا تھا۔ تجوّد مرحوم نے اس مجموعہ میں اپنے خود نوشت حالات بھی لکھ دیے ہیں۔ اس مجموعہ کی غزلیات میں بڑی پختگی، شگفتگی اور روانی ہے۔

(۲) "صبر و شکیب کی لوٹ" تجوّد مرحوم کی یہ کتاب ۱۹۰۳ء

میں مطبع نسیم سحر بدایوں سے شایع ہوئی تھی اس مطبع کے مالک مولوی علی احمد خاں اسیر تھے۔ "صبر و شکیب کی لوٹ" پر پہلے بیخود بدایونی کا دیباچہ ہے۔ اس دیباچہ کے بعد تضمین درج ہے اس تضمین میں ۲۰ بند ہیں تضمین کے دو تقریظیں اور ایک قطعۂ تاریخ ہے۔ تقریظ حکیم سید محمد حسین صاحب حسن کی ہے۔ اس کے بعد دوسری تقریظ اور قطعۂ تاریخ مولانا علی احمد خاں اسیر کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ مخمس دیوان میں شامل ہے۔ اس پر ایک مقالہ مولانا حامد حسن قادری کا "زمانہ" کانپور جون ۱۹۳۵ء میں شایع ہو چکا ہے۔

(۳) "ہوش و خرد کی دکان" حضرت بیخود بدایونی کی یہ کتاب بھی مطبع نسیم سحر سے شایع ہوئی تھی۔ "صبر و شکیب کی لوٹ" کی طرح یہ بھی ایک تضمین ہے۔ مولانا حامد حسن قادری کا ایک مقالہ "ہوش و خرد کی دکان" پر بھی رسالہ "زمانہ" کانپور ۱۹۳۵ء کے کسی شمارے میں شایع ہو چکا ہے یہ مخمس بھی ان کے دیوان میں شامل ہے۔

(۴) "فسانۂ بیخود" یہ ایک واسوخت ہے جس کے کئی ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ یہ واسوخت روایتی نہیں بلکہ واقعاتی ہے اور مرحوم کے عہد جوانی کی یادگار سمجھنا چاہیے۔ اس واسوخت کا قلمی نسخہ جو بیخود مرحوم کا لکھا ہوا ہے بدایوں میں ایک صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

بیخود بدایونی مرزا داغ کے شاگرد و جانشین تھے اور نہایت متین اور سنجیدہ شعر کہنے والوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ داغ کے حلقۂ تلامذہ میں بیخود بدایونی، سیماب اکبرآبادی، جوہر گوالیاری اور جوش ملسیانی ہی شاید ایسے شاگرد ہیں جن کا کلام جذبات کی بلندی اور فکر و تخیل کی گہرائی کے لحاظ سے بہت ہی بلند ہے۔ ورنہ داغ کے کلام میں یہ خوبیاں آپ کو نظر نہیں آئیں گی۔ بیخود کے کلام میں روانی، صفائی، بے ساختگی اور محاورات کی برجستگی بھی اپنے استاد داغ کی طرح پائی جاتی ہے۔ بیخود بدایونی کے سلسلے میں دو ادیبوں کی رائے ملاحظہ فرمایئے:-

مولانا ضیا احمد بدایونی یکم فروری ۱۹۴۳ء کے "ہماری زبان" میں بیخود بدایونی کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:-

"ان کی شاعری روایتی ہرگز نہیں بلکہ واقعی ہے۔ اس میں اساتذۂ دہلی کی طرح صدق جذبات اور لطف زبان بدرجۂ کمال ہے۔ استاد داغ نے اپنے تلامذہ میں جن دو صاحبوں پر ناز کیا ہے، وہ بیخود ہی ہیں یعنی بیخود دہلوی اور بیخود بدایونی۔ مرحوم ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ اچھے نثر نگار بھی تھے جیسا کہ مرآۃ الخیال کے مقدمہ کی عبارت سے ظاہر ہے۔"

۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو وکٹوریہ پارک بدایوں میں ایک مشاعرہ ہوا تھا اس کا گلدستہ شایع ہو چکا ہے اس گلدستہ کی تمہید لکھتے ہوئے محمد اعزاز عالم، بیخود مرحوم کے بارے میں فرماتے ہیں:-

"آخر وقت میں جب ہندوستان میں فصیح الملک داغ دہلوی کا دور دورہ ہوا تھا تو بیخود بدایونی نے ان کے تلامذہ میں اچھا نام پیدا کیا۔"

بقیہ مراسلات

تامل ناڈ کا ادبی مجموعہ

ریاست تامل ناڈ اپنی گوناگوں سیاسی اور ادبی خصوصیات، اور شعر و سخن کے اعتبار سے تاریخ میں ہمیشہ ایک ممتاز حیثیت کی حامل رہا ہے۔ لیکن یہاں سیاسی تاریخ کے نقوش جس قدر اجاگر ہیں اسی قدر اور شعر و سخن کے "گنج ہائے گراں مایہ" اب تک گمنام بلکہ روپوش ہیں۔

حقیقت ہے کہ تامل ناڈ کے ارباب فن نے ہر دور میں اقلیم سخن میں اپنی بھرپور صلاحیت اور تخلیقی جوہر کا بہترین ثبوت دیا ہے۔

اور یہ ثبوت

آپ کو "نقوش ادب" (منتخب شعری ادب) کے مطالعہ سے ملے گا جو عنقریب دلآویز گیٹ اپ، دلکش ترتیب اور جلد رعنائیوں کے ساتھ شایع ہونے والا ہے۔

اس ادبی مرقع میں گزشتہ نصف صدی کے خیال انگیز شاہکاروں کے علاوہ شاعری کے تدریجی ارتقا کے متعلق مضامین اور جدید اسلوب و طرز فکر کی نمائندہ تخلیقات کا بہترین انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مجموعہ میں مختلف علاقائی زبانوں کے فن پاروں کے اردو ترجمے، تامل ناڈ کے دکھنی لوک گیت وغیرہ بھی شامل ہوں گے۔

(کاوش بدری)

شعرائے راجستھان سے التماس

چین کے جارحانہ حملے کے خلاف شعرائے راجستھان نے اپنے جذبات کا اظہار جن نظموں کے ذریعے کیا ہے ان کا مجموعہ جناب ابوالفیض عثمانی صاحب لکچرر شعبۂ اردو ایس۔ کے گورنمنٹ ڈگری کالج سیکر (راجستھان) مرتب کر رہے ہیں۔ ابھی بہت سے ایسے شعرا باقی ہیں جن کا کلام مجموعے میں شامل نہیں ہو سکا ہے لہٰذا ایسے راجستھانی شعرائے کرام سے التماس ہے کہ وہ چین کے حملے سے متعلق اپنا کلام حسب ذیل پتہ پر ارسال فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ مجموعے میں شامل ہو سکے۔

کلیم الدین تجلی
اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان تسلیم منزل بیجہ

نیر اقبال

سر ولیم جونز اور سنسکرت تعلیم

سر ولیم جونز کے سلسلے میں ایک بے حد دلچسپ مقالہ ہندوستان ریویو کے جون ۱۹۰۷ء کے شمارہ میں ملتا ہے۔ اس مقالہ کے مصنف شری ایس۔ سی سانیال ایم۔ اے ہیں۔ یہ مضمون بے حد پُرلطف ہے۔ اس وقت ہندوستان کے باشندے غیر ملکیوں کو جس نظر سے دیکھتے تھے اس کی بڑی اچھی تصویر یہ مضمون پیش کرتا ہے۔ ولیم جونز نے سنسکرت، ہندوستان آنے کے بعد سیکھی تھی۔ اس سلسلے میں ان کو کیا کیا پریشانیاں اٹھانی پڑیں انھیں کی تفصیل اس میں درج کی گئی ہے۔

اس مضمون سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ سر ولیم جونز نے یہاں آتے ہی اپنے ہندوستانی نوکروں کی مدد سے کچھ ہندستانی سیکھ لی اور اس قابل ہوگئے کہ اس زبان میں اپنا مدعا بیان کر سکیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس ملک کی تہذیب کی "اصل کنجی" سنسکرت زبان کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلے میں ان کو سب سے پہلے ایک پنڈت کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن اس زمانے میں ایک انگریز کو سنسکرت پڑھانے کے لئے کسی پنڈت کا ملنا آسان نہ تھا۔ سر ولیم جونز نے بہت کوشش کی ان کے دوست کرشن نگر کے مہاراج شو چندر نے اس سلسلے میں ان کا بڑا ساتھ دیا۔ سر ولیم جونز نے بہت بڑی تنخواہ کا بھی لالچ دیا لیکن تمام کوششیں بیکار گئیں اور ایک غیر ملکی ناپاک ہستی کو کوئی بھی پنڈت وید اور شاستر کی الہامی زبان سکھانے پر راضی نہیں ہوا۔ اگر کسی نے اس کام کے لئے اپنی آمادگی بھی ظاہر کی تو اسکی برادری نے اسکے بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی۔

سر ولیم جونز نے کلکتہ کے پنڈتوں سے ناامید ہو کر کلکتہ سے باہر جاکر قسمت آزمائی کرنے کی ٹھانی، لیکن یہاں بھی ان کو ناکامی ہی کا منھ دیکھنا پڑا اور وہ کلکتہ واپس چلے آئے۔ ولیم جونز اس پر بھی ناامید نہیں ہوئے اور اپنی کوشش جاری رکھی۔ آخر میں ایک سنسکرت داں جو ویدانت سے تعلق رکھتا تھا ان کو سنسکرت پڑھانے پر راضی ہو ہی گیا۔ اس کا نام رام لوچن کوی بھوشن تھا۔ یہ دنیا میں اکیلا ہی تھا اور اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ وہ ہوڑے کے قریب ہی رہتا تھا اور اسے کسی سے سروکار نہ تھا۔ الگ تھلگ زندگی گزارنے کی وجہ سے اس کو برادری سے خارج کئے جانے کی بھی پروا نہ تھی۔ یہ پنڈت جی حکمت بھی جانتے تھے اور پاس پڑوس میں اکثر علاج کے لئے بلائے جاتے تھے اس لئے انھوں نے سوچا کہ اگر وہ اس غیر ملکی کو سنسکرت پڑھانے بھی لگیں گے تو ان کا محلہ ان کو چھوڑ نہ سکے گا، اور کسی کے بیمار پڑنے پر لامحالہ ان ہی کو بلانا پڑے گا کیوں کہ اس علاقے میں دوسرا کوئی وید تھا ہی نہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد رام لوچن جی ولیم جونز کو سنسکرت پڑھانے پر راضی ہو گئے تنخواہ سو روپیہ مہینہ اور سنکیہ سے چورنگی تک آنے اور جانے کے لئے پالکی کی سواری مقرر ہوئی۔

ان کوی بھوشن جی نے سر ولیم جونز سے بڑی بڑی شرطیں طے کیں۔ ولیم جونز کو سنسکرت سے ایسی والہانہ شیفتگی تھی کہ انھوں نے تمام شرطیں منظور کر لیں۔ ان کے بنگلے کی نچلی منزل کا ایک کمرہ پڑھانے کے لئے پسند کیا گیا۔ اس کے فرش پر سنگ مرمر بچھایا گیا۔ ایک ہندو نوکر رکھا گیا جس کا فرض یہ تھا کہ وہ روزانہ صبح تڑکے ہگلی سے پانی لاکر فرش اور دیواروں کو دھوئے۔ اس میں صرف دو تین لکڑی کی کرسیاں اور ایک میز رکھی گئی۔ یہ سب چیزیں بھی روز دھلا کرتی تھیں پڑھنے کے لئے صبح کا وقت مقرر ہوا۔ سر ولیم جونز کو حکم دیا گیا کہ پڑھنے کے کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے ایک پیالی چائے کے سوا کچھ نہ کھائیں پئیں۔ ساتھ ہی حکم بھی ہوا کہ گوشت اس پورے عرصہ میں ان کے بنگلے کے اندر نہ جانے پائے۔ ایک کمرہ پنڈت جی کو کپڑے بدلنے کے واسطے دیا گیا۔ وہ بھی روز دھویا جاتا تھا۔ دو جوڑے کپڑے الگ سے بنائے گئے ان میں سے ایک اس کمرے میں رکھا جاتا تھا۔ پنڈت گھر سے پہن کر آتے تھے وہ اس کمرے میں اُتار دیا جاتا اور رسیاں پر رکھا جوڑا پہن کر پڑھاتے اس کے بعد چلتے وقت پڑھانے والا جوڑا کمرہ میں رکھ دیا جاتا اور گھر کا جوڑا پہن کر وہ واپس چلے جاتے۔

سر ولیم جونز جو تھوڑی بہت ہندستانی زبان جانتے تھے اسی کے سہارے سے پڑھائی شروع ہوئی استاد اور شاگرد دونوں یکجا ہوتے اور ایسے کام چل گیا لیکن پڑھنے پڑھانے کا طریقہ کیا تھا اس سلسلے میں کوئی معلومات فراہم نہیں ہوئیں۔

کہا جاتا ہے کہ سر ولیم جونز کے یہ استاد بڑے ہی تند مزاج تھے اگر کبھی سر جونز کسی بات کو دو تین بار پوچھتے تو ان کو غصہ آجاتا اور وہ کہتے کہ "یہ مضمون بڑا ہی پیچیدہ ہے اور گائے کا گوشت کھانے والوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا" لیکن سر جونز کو ان سے بڑی انسیت ہوگئی تھی وہ ان کی عزت بھی بیحد کرتے تھے۔ اس لئے وہ ان کی ہر زجر و توبیخ کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔

پنڈت رام لوچن کوی بھوشن ۱۸۱۲ء تک زندہ رہے۔ وہ شاعری، ڈرامہ، علم العروض اور قواعد کے بڑے عالم تھے لیکن فلسفہ اور دوسرے علوم سے ان کو زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ ان علوم کو سیکھنے کے لئے سر جونز کو دوسرے پنڈت کا سہارا لینا پڑا۔

بعض شواہد کی بنا پر یہ تفصیل حرف بحرف صحیح نہیں معلوم ہوتی مثلاً مشکلات کی جو بھیانک تصویر اس مقالہ میں پیش کی گئی ہے اسے اس درجہ بھیانک سمجھتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ یہ ولیم جونز سے پہلے بھی کچھ غیر ملکی سنسکرت سے واقفیت بہم پہنچا چکے تھے ان میں سے ایک، تو چارلس ولکنس بھی تھے جو ایشیاٹک سوسائٹی اوف بنگال کے بانیوں میں سے تھے اور جو آگے چل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس لائبریری کے پہلے لائبریرین مقرر کئے گئے، جو اب انڈیا آفس لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ صاحب سر ولیم جونز کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔

آر بری (Arberry) کے بیان کے مطابق ولکنس نے ولیم جونز کو ان کی ابتدائی کوششوں میں بے حد مدد بھی دی تھی۔ یہ سر جونز سے پہلے ہی ہندو مذہبیات کی کئی کتابوں کا سنسکرت سے انگریزی میں ترجمہ بھی کر چکے تھے۔ ان سے بھی بہت پہلے مشنریوں نے سنسکرت کی تعلیم و تدریس کا انتظام کیا تھا اور سنسکرت اصول و قواعد پر کچھ کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن میں سب سے قدیم کتاب غالباً وہ ہے جو کسی پادری نے آگرہ میں سینٹ جیمس کالج میں لکھی۔

ڈاکٹر وحید اختر

تبصرہ

زخمِ تمنا

مظہر امام نئی نسل کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کی آواز اور لہجہ جانا پہچانا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کی ۱۰، ۱۵ برس کی کاوشوں کا انتخاب ہے۔ ۴۸ء سے ۶۲ء تک ان کی شاعری تجرباتی دور سے گزری ہے اس دوران میں غزلوں نے ہیئت اور اسلوب میں تو کوئی خاص تجربہ نہیں کیا لیکن اپنی بات کہنے کا انداز ضرور سیکھا ہے۔ شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے اور مظہر امام کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ غزلوں نے پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی شخصیت کے ہر پہلو، مزاج کے ہر رنگ اور فکر و احساس کے ہر اتار چڑھاؤ کی ترجمانی کی ہے۔ یہ شاعری موجودہ دور کے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے نامساعد حالات، خرابیٔ صحت، مایوسی و محرومی اور موت کے آسیب کا جسمانی اور ذہنی مقابلہ کیا ہے اس جد و جہد میں ان کی آواز میں یاسیت کی گہری پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں اور امید کی ہلکی ہلکی روشنی بھی جو غمِ کائنات کے مرکز پر سمٹ کر مستقبل اور انسانیت پر ایمان رکھنے والی شاعری بن جاتی ہے۔

مظہر امام کی غزلیں "حکایتِ مہر و وفا" کے بکھرے ہوئے پارے ہیں اپنے مزاج کے لحاظ سے انھیں قصۂ سکندر و دارا سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن ان کی نظمیں "سیاستِ دوراں" کو سمجھنے کی کوششوں سے بھی عبارت ہیں اور غمِ ذات و غمِ جاناں کی آئینہ دار بھی۔ وہ آج کے ہر سوچنے والے حساس ذہن کی طرح خود کو اپنے عہد میں اجنبی جانتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہی احساسِ اجنبیت آج کے شعر و ادب کا سب سے اہم موضوع ہے اس لئے وہ اپنے ہم عصروں کے درمیان اجنبی نہیں، نظمیں ہوں یا غزلیں، دونوں ایک ہی دل و دماغ کی پیداوار ہیں اس لئے یہ حکم لگانا مناسب ہوگا کہ ان کو کس صنف سے طبعی مناسبت ہے۔ شاعری اصناف میں بٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ جذبہ اور خیال اپنی مناسبت سے اصناف کا انتخاب کرتے ہیں، اسی لئے مظہر امام غزلوں اور نظموں میں اپنے انکشافِ ذات میں یکساں کامیاب نظر آتے ہیں۔

مقدمہ لکھنا اور لکھوانا دونوں کام آج کل رسمی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اور قاری کے درمیان تعارف نگار کا واسطہ ہی نہ ہو۔ تنقید جہاں کسی تخلیق کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے وہیں فنکار کے بارے میں غلط فہمیاں بھی پیدا کرتی ہے، یہ لازمی نہیں کہ تعارف نگار اور شاعر کا ذہن ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی ہو۔ مظہر امام نے اپنا تعارف آپ ہی کرا دیا ہے۔ لیکن یہ کام بھی اپنی جگہ آسان نہیں، اس لئے کہ جہاں یہ خطرہ رہتا ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص تعارف لکھے تو وہ شاعر کی غلط ترجمانی کر سکتا ہے وہیں کبھی کبھی خود شاعر اپنی تخلیقات کو سمجھانے کے سلسلے میں خود بھی بھٹک سکتا ہے۔

مظہر امام کے مقدمے میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے مایوسی و محرومی کی جو لے اپنی ذات و شعر کی تفسیر کے لئے پسند کی ہے وہ ان کی شاعری کا سب سے نمایاں عنصر نہیں۔ ان کی شاعری صرف شکستِ رنگ کی جھنکار ہی نہیں گلِ نغمہ اور پردۂ سازِ فردا بھی ہے۔ بعض جگہ ادب و شعر کی ترقی پسند تحریک کی جھلک ان کے یہاں صاف دکھائی دیتی ہے اور جدید تخلیقات سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو غمِ ذات کے محور پر لانے کی شعوری کوشش کی ہے جو جدید شاعری کا نمایاں رجحان ہوتے ہوئے بھی ایسا رجحان نہیں کہ اس پر بہت زیادہ زور دیا جائے۔ دنیا کی مادی اور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی ترقی کے نئے نئے افق بھی سامنے آ رہے ہیں، اور اردو کی جدید شاعری پر واجب ہے کہ ان کی طرف سے آنکھیں بند نہ کرے ہمارے ہم عصر شاعروں کے لئے اس میدان میں کافی امکانات ہیں اور شاید مظہر امام خود اس راز سے بے خبر نہیں۔

زخمِ تمنا موجودہ دور کی زخمی آواز کی بازگشت ہے اور ہندوستان میں اردو کی نئی شاعری کی ایک قابلِ مطالعہ مثال۔ یہ کتاب اڑیسہ اردو پبلشرز، دیوان بازار کٹک نے شائع کی ہے اور اسی پتے سے یہ کتاب طلب کی جا سکتی ہے، قیمت تین روپے ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر بدر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا